خلافتِ راشدہ میں اسلامی معیشت
ایک مطالعہ

پروفیسر محمد یٰسین مظہر صدیقی

اسلام زندگی کے تمام مسائل میں راہ نمائی فراہم کرتا ہے۔ معیشت بھی اس کا ایک حصہ ہے۔ موجودہ دور میں معیشت بہت پر پیچ ہوگئی ہے اور اس نے غیر معمولی اہمیت اختیار کر لی ہے۔ اسلامی معاشیات کے بعض پہلوؤں پر قدماء کی تصانیف موجود ہیں، جیسے امام ابو یوسفؒ یا یحییٰ بن آدمؒ کی خراج سے متعلق کتابیں۔ بعض کتابیں اس موضوع پر نسبتاً جامع بھی ہیں، جیسے ابو عبید کی 'کتاب الاموال'۔ لیکن ان تصنیفات کا انداز قدیم ہے۔ اس لیے جدید ذہن کے لیے ان سے استفادہ میں دشواری محسوس ہوتی ہے۔ البتہ یہ موضوع محدثین اور فقہاء کے ہاں زندگی کے اور موضوعات کی طرح زیادہ تفصیل سے زیر بحث آیا ہے۔ اس میں انھوں نے رسول اللہ ﷺ کی تعلیمات اور خلفاء راشدین کے تعامل ہی کو بنیاد بنایا ہے۔ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ مختلف اسلامی ممالک میں اس پر عمل درآمد کی تفصیلات سے وہ ناواقف تھے۔ ہاں اس کے فہم و تطبیق میں ان کے درمیان اختلافات رہے ہیں جو فطری ہیں۔ فاضل مضمون نگار نے مفتوحہ اراضی، ان کی اقسام، عشری اور خراجی زمین، خراج، جزیہ اور اس کی مقدار وغیرہ کے سلسلے میں جو تفصیلات فراہم کی ہیں وہ ہماری کتب فقہ وحدیث میں موجود ہیں۔ اس کے باوجود مضمون میں بعض مغربی مصنفین کے حوالہ سے جو تاریخی معلومات فراہم کی گئی ہیں ان کی افادیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ ہمارے خیال میں یہ موضوع مزید مطالعہ اور تحقیق کا متقاضی ہے۔ اہل علم سے توجہ کی درخواست ہے۔ (جلال الدین)

معیشت خواہ اسلامی ہو یا غیر اسلامی، خاصی پیچیدہ شے ہے، مگر اس کی پیچیدگی کا ادراک کم کیا گیا ہے۔ اس کا تعلق انسانی زندگی کے مختلف میدانوں سے ہے اور وہ ان تمام میدانوں کی کارکردگی کو متاثر کرتی ہے۔ معیشت پر سماجی عوامل اپنی کارفرمائی کرتے ہیں، سیاسی اتار چڑھاؤ کے اپنے تقاضے ہوتے ہیں، تہذیبی نظریات کا اثر الگ ہوتا ہے، تمدنی ادارے اور افکار کے خاص نتائج ہوتے ہیں اور ان سب پر مستزاد یہ کہ دینی اور مذہبی فکر و خیال کا رنگ ہر ایک میدان میں صورت گری کرتا ہے۔ جب کہ بعض تاریخی عوامل کی کارفرمائی غیر محسوس ہوتی ہے۔

اسلامی معیشت کا معاملہ اور بھی پیچیدہ ہے۔ خود اس کے اپنے احکام و اصول اور نظریات و اعمال ہیں، پھر اس کا تعلق سابقہ یا معاصر معیشتوں سے بھی لازمی طور سے خاصا گہرا اور پیچیدہ ہوتا ہے۔ عہدِ نبوی میں اسلامی معیشت کی بنیاد میں عرب جاہلی کی معاشی زندگی کے علاوہ دوسرے متعدد معاشی افکار و اعمال موجود تھے۔ یہودی، مسیحی، مجوسی اور حبشی معاشی افکار و نظریات اور اداروں کے علاوہ بعض اور چیزوں نے بھی اس کی تشکیل میں حصہ لیا تھا۔ پھر خلافتِ راشدہ کے آغاز ہی میں عالمی اسلامی فتوحات کے سلسلے نے اس کو عالمی معیشت سے مربوط کر دیا تھا۔

تمدنی حقیقت یہ ہے کہ اس کا ایک گوشہ اور ایک زاویہ بھی آزاد و خود مختار یا بلا ارتباط نہیں ہوسکتا ہے۔ کیونکہ تہذیب و تمدن بقول امامِ فلسفۂ تاریخ ابنِ خلدونؒ (م ۱۴۰۶ء) تمام انسانی کاوشوں کے مجموعی نتیجہ کا نام ہے۔ پیش رو اس کی تعمیر کرتے اور جانشین اس کو اخذ کرتے ہیں اور عہد بہ عہد، نسل در نسل اور عصر بہ عصر اس کی نشو و نما ہوتی رہتی ہے۔ ہر دور کی تہذیب مجموعی انسانی کاوش پر مبنی ہوتی ہے۔ اسلامی معیشت بھی، اسی طرح سابقہ امتوں، قوموں، ملکوں، اداروں اور انسانی کاوشوں کی دین ہے۔

عہدِ نبوی میں مکی دور (۶۱۰-۶۲۲ء) کی حد تک اسلامی معیشت قریشی جاہلی معیشت پر استوار رہی۔ عرب جاہلی معیشت کے بارے میں یہ حقیقت ہمیشہ واضح اور پیش نظر رہنی چاہیے کہ دینی لحاظ سے اس کی بنا دینِ ابراہیمی کے اصول و نظریات اور

اداروں پر قائم تھی اور اس میں خالص عرب اور قریشی نظریات و اعمال کے مقامی اثرات بھی کارفرما تھے۔ بین الاقوامی تجارتی ارتباطات کی وجہ سے عرب جاہلی معیشت پر شام کے بازنطینی اور رومی اثرات بھی تھے اسی طرح یمن، عراق و ایران سے تجارتی تعلقات کی وجہ سے اس پر ایرانی - مجوسی معاشی افکار و نظریات کا سایہ بھی پڑا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ رسولِ اکرم ﷺ نے تجارت و زراعت اور مدنی دور میں اسلامی محاصل کے نظام میں ان مقامی اداروں کو قبول کیا تھا۔ مثلاً اسلامی ریاست کے غیر مسلم شہریوں پر محاصل ان کے معروف اداروں کے تحت بلکہ وہی خالص طور سے عائد کیے گئے تھے۔ جزیہ بجائے خود ایرانی - بازنطینی تصور و عمل ہے اور وہ ان دونوں بین الاقوامی معیشتوں سے ہی اسلام میں آیا تھا۔ ورنہ عربوں میں یا عرب جاہلی معیشت میں اس کا وجود تھا نہ عمل۔ اس کے علاوہ جزیہ کی شرح مختلف علاقوں میں مختلف رہی، یکساں نہ تھی، جس طرح زمین کی پیداوار پر محصول/ مالیۂ آراضی مختلف خطوں میں جدا جدا تھا، یکساں نہ تھا۔

خلافتِ راشدہ (۶۳۲-۶۶۰ء) اور اس کے بعد خلافتِ اموی (۶۶۱-۷۵۰ء) میں نبوی میراث جاری رہی۔ اولین تین خلفائے راشدین - حضرات ابوبکر صدیق، عمر فاروق اور عثمان غنی رضی اللہ عنہم - کے دورِ مسعود میں فتوحاتِ اسلامی کے نتیجے میں مالی اور معاشی نظام امت میں قائم ہوا تو تفصیلات و جزئیات تو معاصر اسباب و عوامل نے فراہم کیں، مگر اصول و احکام عہدِ نبوی ہی کے بروئے کار لائے گئے۔ دوسری اقوام و ممالک سے ارتباط کی بنا پر ان کے معاشی نظریات و افکار کے علاوہ ان کے ادارے اور ان کے انتظامات قبول کیے گئے، البتہ اسلامی فکر اور رعایا کی آسانی کے لیے تبدیلیاں کی گئیں۔ تحقیقاتِ جدیدہ نے، جو اسلامی معروف مآخذ پر مبنی ہیں، واضح کیا کہ مفتوحہ ممالک و دیار میں مروج مالی ادارے پوری طرح اسلامی نظامِ معیشت میں جذب کر لیے گئے۔ انہی کی رہنمائی میں مسلم فاتحین نے اولاً اور خلفائے اسلام نے اصلاً اسلامی معیشت کی تشکیل کی۔ فطری اور تاریخی ارتقاء کے تسلسل کے تحت اموی خلفاء نے خلافتِ راشدہ کے نظامِ معیشت کو مزید مستحکم کیا۔

مصادرِ اسلامی کی روایات وآثار

اس پُر پیچ نظامِ معیشت کی صحیح تفہیم میں اسلامی روایات کا اہم ترین کردار ہے۔ وہ بنیادی طور سے تین قسم کی مصادر میں ملتی ہیں: ایک تاریخی مآخذ میں، بالخصوص فتوحات/فتوح پر مبنی تاریخی کتابوں میں۔ ان میں تاریخ طبری، فتوح البلدان بلاذری، اور اسی نام کی یعقوبی اور ابن اعثم کوفی کی کتبِ تاریخ بنیادی مآخذ ہیں۔ دوسرے فقہاء کرام کی کتبِ اموال ہیں، جیسے امام ابو یوسف کی کتاب الخراج اور یحییٰ بن آدم وغیرہ کی اسی نام کی متعدد کتابیں۔ تیسرے وہ ماہرین و متخصصین ہیں جو کتاب الاموال اور نظامِ معیشت کی تفصیلات تک محدود رہتے ہیں۔ جیسے امام ابوالقاسم عبید بن سلاّم کی کتاب الاموال اور ابوالحسن ماوردی کی کتاب الاحکام السلطانیہ کو بھی اسی قسم میں شامل کیا جاسکتا ہے۔ مقامی فتوح پر مبنی کتابیں، جیسے عبدالحکم کی فتوح مصر یا مقریزی کی خطط اور مقامی اسلامی تاریخ کی کتابیں بھی دوسرے مآخذ ہیں۔ ان سب سے زیادہ مستند وہ معاصر اسلامی دستاویزات ہیں جو متعدد مستشرقین نے مصری آثار قدیمہ کے خزانوں سے ڈھونڈ کر پیپری ریکارڈ (Papyri Records) کے نام سے شائع کی ہیں۔ وہ خلافتِ اسلامی کی معاصر دستاویزات ہیں۔

اسلامی نظام معیشت پر ان اسلامی مصادر پر مبنی اور ان سے مستفاد جدید دور کی خاص تصانیف بھی ملتی ہیں۔ ان میں تو کئی اقسام ہیں، لیکن ان کو بھی بنیادی طور سے دو قسموں میں رکھ کر مطالعہ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اصل مبحث سے متعلق ہیں: ایک مسلم اہل علم کی کتابیں ہیں۔ ان میں سے مشرقی روایات کے پاس دار اہلِ قلم کے ہاں تجزیہ وتحلیل کی سخت کمی ہے اور وہ بالعموم اس پیچ در پیچ سلسلۂ معیشت کی صحیح تفہیم ہی نہیں رکھتے۔ وہ صرف چند روایات بلا تناظر بیان کرتے ہیں۔ دوسرے عام مستشرقین ہیں جو اپنے خاص معاشی اہل قلم کے خوشہ چیں ہیں۔ متخصصینِ معیشت کا المیہ یہ ہے کہ ان میں سے متعدد عربی زبان وادب اور اسلامی تاریخ وتہذیب سے خاطر خواہ واقفیت نہیں رکھتے تھے اور وہ

اپنے خاص قومی یا علمی نظریات کے اسیر تھے۔ وہ بھی مسلم اہلِ علم کی مانند اپنے پیش رووں کے نظریات و افکار کی پیروی کرتے نظر آتے ہیں اور خالص مقلد ہیں۔ ان میں سے بعض نے البتہ اسلامی نظامِ معیشت کو صحیح اسلامی، تاریخی تناظر میں سمجھنے اور سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ اس طبقہ کے سرخیل ایک امریکی مصنف ڈینیل، سی، ڈینیٹ (Daniel C. Dennett) ہیں جو ایک شاہ کار کتاب Conversion and the Poll-Tax in early Islam کے مصنف ہیں۔ اس کا اردو ترجمہ مولانا غلام رسول مہر نے ۱۹۶۲ء میں لاہور سے شیخ غلام علی اینڈ سنز کے تعاون سے شائع کیا ہے جس میں ان کے حواشی بھی ہیں۔

صحیح تناظر میں مطالعہ و تجزیہ کا مسئلہ

اسلامی روایات و آثار کا سب سے بڑا مسئلہ یہ ہے کہ وہ عام قاری کو متضاد و متصادم نظر آتی ہیں۔ مسلم اہلِ علم کا سخت المیہ یہ ہے کہ وہ ایک دو روایات و آثار کی بنا پر اسلامی نظامِ معیشت کی بازیافت کرتے ہیں۔ ان میں سے اکثریت کا یہ حال ہے کہ وہ تمام متعلقہ روایات و اخبار کا مطالعہ ہی نہیں کرتے اور تحلیل و تجزیہ سے گریز کرتے ہیں۔ روایات و آثار کے تضاد و تصادم کے باب میں ان کا رویہ اور بھی غیر علمی ہے۔ یا تو وہ متضاد و متصادم روایات کو نظر انداز کرتے ہیں، یا ان کو تضاد سمیت بیان کر کے نکل جاتے ہیں۔ وہ ان پر محاکمہ کرتے ہیں، نہ تنقید و تجزیہ کر کے اصل معاملہ کو واضح کرتے ہیں۔

دوسری طرف مستشرقین کا گروہ ہے جو اپنے خاص عقائد و نظریات کے تحت ان روایات کا تجزیہ کرتا ہے۔ ان کا طریقۂ تحقیق اور بھی دل چسپ ہے۔ وہ اپنے نقطۂ نظر سے ہم آہنگ روایات کو قبول کر لیتے ہیں اور اس کی مخالف روایات کو بلا دلیل مسترد کر دیتے ہیں کہ وہ صحیح روایات ہی نہیں ہیں۔ بعض مستشرقین نے یہ وتیرہ اختیار کیا ہے کہ وہ کسی ایک روایت، خبر، دستاویز وغیرہ سے اپنے مطلب کا جملہ یا حصہ لے لیتے ہیں اور بقیہ روایت و خبر کو مسترد یا نظر انداز کر دیتے ہیں، کیونکہ وہ ان کے نقطۂ نظر کی تردید کرتی ہیں۔

اصل مسئلہ یہ ہے کہ ایسی تمام ظاہری روایات و اخبار درحقیقت متضاد و متصادم ہیں بھی یا نہیں؟ حقیقت یہ ہے کہ وہ متضاد و متصادم نہیں ہیں۔ ان کو ان کے صحیح تاریخی

پس منظر کے اندر رکھنے سے ان کا ظاہری تضاد دور ہو جاتا ہے۔ ڈینیٹ نے یہی کیا کہ اسلامی فتوحات کے ضمن میں ان تمام متضاد روایات کو ان کے صحیح تاریخی تناظر میں رکھا تو وہ دور ہو گیا۔ چنانچہ ان کا واضح بیان ہے کہ فقہاءِ اسلام اور مآخذِ تاریخ کی ایسی تمام روایات مختلف احوال وادوار کی روایات ہیں۔ مثلاً دمشق، اسکندریہ وغیرہ شہروں اور علاقوں کے بارے میں جو مختلف روایات ملتی ہیں ان کا تعلق پہلی یا دوسری یا تیسری فتح سے ہے، وہ سب کی سب ایک ہی زمانہ یا واقعہ سے متعلق روایات نہیں ہیں۔ محقق موصوف نے دوسرے مستشرقین کے اس ناقص مطالعہ کو واضح کرنے کے علاوہ ان کی مطلب خیز روایت یا حصۂ روایت کو قبول کرنے کو بھی اجاگر کیا ہے۔

انواعِ آراضی

عام اہلِ قلم بلکہ بعض خاص لکھنے والوں نے ایک ہی علاقہ، دیار اور خطہ کے مختلف معاشی انتظامات میں فرق نہیں کیا اور سب کو ایک ہی قسم کی فتح کا شاخسانہ قرار دے کر تمام مفتوحہ ممالک کا نظامِ معیشت یکساں سمجھ لیا۔ حالانکہ اصل مآخذ نے ان کا فرق وامتیاز قدم قدم پر بتایا اور واضح کیا ہے کہ تمام مفتوحہ علاقے مختلف قسم کے نظامات رکھتے تھے۔

ان میں بنیادی مشترک عنصر یہ ہے کہ مفتوحہ خطہ اور شہر کے سابقہ معاشی اداروں سے کسبِ فیض کیا گیا، جو نظامِ معیشت بازنطینی، ایرانی، مجوسی، رومی وغیرہ ادوار حکومت سے چلا آ رہا تھا اسے ترمیم کے بعد قبول کر لیا گیا۔

اسلامی مفتوحہ ممالک میں آراضی اور اس کے محاصل ومالیات کی کئی اقسام تھیں:

۱- بزور وطاقت فتح، جسے اسلامی مآخذ بالعموم 'فتح عنوۃ' قرار دیتے ہیں۔ ایسے تمام مفتوحہ ممالک میں اسلامی فاتحین اور خلفائے وقت آراضی کے مالک بن جاتے تھے اور ان پر قابض زمین دار و کسان ان کے اہلِ کار۔ اسلامی حکومت ان کے مالیہ و محاصل کی تعیین میں آزاد و خود مختار ہوتی تھی، وہ جو نظامِ محاصل چاہتی تھی مقرر کر سکتی تھی۔ بٹائی پر آراضی پرانے قابضوں کو دے سکتی تھی اور یہ بٹائی متناسب بھی ہو سکتی تھی، یعنی ہر فصل کا ایک متناسب حصہ جو ۱/۲ (نصف) سے کم، ایک ۱/۳ (ثلث)، ۱/۴ (ربع) یا ۱/۵

(خمس) ہوسکتا تھا اور فی الواقع ہوتا بھی تھا۔ دوسرے وہ ہر ایک علاقے کی زمین کی مساحت کے بعد اس پر ہر فصل کی ایک خاص متعینہ مقدار وصول کرسکتی تھی۔ یعنی پیداوار کچھ بھی ہو، مگر اسلامی حکومت مثلاً سووسق گندم ایک کھیت سے لے گی یا اتنے اردب شعیر (جَو) وصول کرے گی۔

۲- صلح کے ذریعہ فتح کی ہوئی آراضی میں فریقین- اسلامی ریاست اور زمین دار و کاشت کار- کے درمیان ایک معاہدہ صلح ہوجاتا تھا جس کے تحت اسلامی عمال خاص مقدار میں پیداوار کا حصہ لیتے تھے اور اس میں کمی بیشی کا حق بھی حکومت کو تھا، کہ وہ آبادی کی کمی یا پیداوار کی بیشی کے مختلف حالات میں محصولِ پیداوار گھٹا بڑھا سکتی تھی اور درحقیقت کرتی بھی تھی۔

۳- عہد آراضی کا معاملہ سب سے مختلف تھا۔ اس کے مالکان اور کاشت کاران بلا مزاحمت ہتھیار ڈال دیتے تھے اور اسلامی فاتحین کے آتے ہی ان سے صلح و معاہدہ کی درخواست کرتے تھے، جو اسلامی حکومت قبول کرلیتی تھی۔ فریقین میں 'شرائطِ عہد' طے ہوجاتے تھے، جن کی پابندی دونوں کے لیے ضروری ہوتی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ کسی بھی صورت میں اسلامی حکومت اس عہد آراضی میں مالیہ و محاصل میں اضافہ نہیں کرسکتی تھی، البتہ اپنی صوابدید سے یا لوگوں کی درخواست پر یا حالات کے انقلاب کے تحت ان میں کمی ضرور کرسکتی تھی اور کرتی تھی۔ بالعموم وہ مقررہ رقم ہوتی تھی جسے خراج کہا جاتا تھا، مگر وہ خراج باج (Tribute) کے معنی میں تھا۔

۴- فے آراضی ان زمینوں کو کہتے تھے جن کے مالکان فتحِ اسلامی کے بعد بھاگ گئے تھے اور ان کی ملکیت حکومت کی طرف منتقل ہوگئی تھی۔ ساتھ ہی ان کا انتظام بھی اسلامی فاتحین، گورنروں اور عاملوں کے سر پر آپڑا تھا۔ یہ خالص ریاستی آراضی یا زمینِ خلافت (Crown Land / State Land) تھی، جسے بعد میں 'خالصہ' بھی کہا گیا ہے۔ اسلامی حکومت ان آراضی - فے آراضی- کی بوائی جتائی، دیکھ بھال اور تمام دوسری چیزوں کی ذمہ دار تھی اور اس کی ساری پیداوار یا اموال کی بھی مالک بن جاتی

تھی۔ فقہائے اسلام اور مورخینِ خلافت نے واضح کیا ہے کہ خلفاءِ اسلام اسی فے آراضی سے اقطاعات مسلم فاتحین، عمال بالخصوص صحابہ کرام کو دیا کرتے تھے۔ مذکورہ بالا تین انواعِ آراضی میں سے کسی خلیفہ نے کسی کو بھی اقطاع نہیں دیا۔ ڈینیل سی ڈینیٹ نے اس کی بھرپور تائید کی ہے۔

۵- بعد کے اسلامی ارتقاء کے نتیجے میں مردہ زمین/ آراضی (احیاءِ موات) کی ملکیت و مالیہ کا اصول نکلا۔ زراعت کی ترقی اور علاقہ کی خوش حالی کے لیے یہ اصول قائم کیا گیا کہ جو شخص کسی بنجر اور مردہ زمین کو اپنی محنت سے قابلِ کاشت بنالے وہ اس زمین کا مالک بن جائے گا، البتہ اسے اپنی پیداوار کا ایک حصہ یا مالیۂ آراضی حکومتِ وقت کو احکام اسلامی کے مطابق ادا کرنا ہوگا۔ عہدِ نبوی سے خلافتِ راشدہ اور خلافتِ امویہ تک ایسے واقعات اور اس قسمِ آراضی کا ذکر مآخذ میں بڑے اہتمام سے کیا جاتا ہے۔

معاشی اصطلاحات کا مسئلہ

اسلامی نظامِ معیشت سے متعلق روایات واخبار میں مختلف اصطلاحات ملتی ہیں۔ ان کی صحیح تفہیم ضروری ہے۔ مصادر یا ان روایات کے رواۃ واخباریین کے بیانات میں ذرا بھی ابہام، غموض یا الجھاؤ نہیں ہوتا، مگر ان کی تفہیم میں درآتا ہے۔ وہ بہت وضاحت سے ان اصطلاحات یا مختلف مالیۂ آراضی وغیرہ کو اپنے اپنے تاریخی پس منظر میں بیان کرتے ہیں، یا جن بیانات میں ان کا ذکر آتا ہے ان کا سیاق وسباق ان کے معنی ومفہوم اور اطلاق کو واضح کردیتا ہے، لیکن بعد کے تجزیہ نگاروں- مسلم وغیر مسلم دونوں- نے اس سیاق وسباق کو صحیح نہیں سمجھا یا، اصلاح کی نوعیت نہیں جانی- اور اس نے مسلم اہلِ قلم کو بھی خاصا پریشان کیا اور ان سے زیادہ اہلِ استشراق نے الجھن وابہام پیدا کرکے غلط ترجمانی کی اور حقیقت سے دور چلے گئے۔ البتہ ڈینیٹ جیسے محققین نے اس اختلافِ اصطلاحات کی حقیقت جان لی۔

- جزیہ قدیم مآخذ اور ان کی روایات میں دو معانی میں استعمال ہوتا ہے: ایک جزیہ سَر/محصولِ سر، جس کو روایات میں 'جزیۃ علی الرقاب' کہا جاتا ہے اور دوسرا جزیہ/

مالیۂ آراضی جو 'جزیۃ علی الارض' سے واضح کیا جاتا ہے۔ جہاں یہ وضاحت نہیں ہوتی وہاں سیاق وسباق واضح کر دیتا ہے کہ محصولِ سر مراد ہے یا مالیۂ آراضی۔

- خراج بھی ذو معنیٰ لفظ ہے۔ وہ اصلاً تو زمین کی پیداوار کا مالیہ ہے، لیکن کبھی کبھی اسے محصولِ سر کے معنیٰ میں بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس فرق وامتیاز کے لیے تشریحی جملہ/فقرہ، یا سیاق و سباق کا پس منظر موجود ہوتا ہے۔

- خراج کے اور معنیٰ بھی ہیں اور اس کا دوسرا اطلاق بھی ہے۔ وہ مالیۂ زمین/آراضی نہ ہو کر کسی مفتوحہ شہر یا علاقے سے ایک مقررہ رقم کے لیے بھی استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کا انگریزی متبادل Tribute ہے، جسے باج بھی کہا جاتا ہے اور اس شہر وعلاقے کے لوگوں کو باج گزار۔ صلح/معاہدہ کے وقت مفتوحہ شہر وعلاقہ کے لوگ یا ان کے نمائندے/حکمراں ایک خاص رقم پر صلح کر لیتے تھے، جیسے حیرہ (عراق) کے لوگ سالانہ ایک لاکھ درہم ادا کرتے تھے۔ اس میں مالیۂ آراضی یعنی پیداوار پر واجب خراج اور محصولِ سر دونوں سے کوئی واسطہ نہ تھا۔ اس کی جمع وادائی میں بھی بالعموم حکومتِ اسلامی دخل نہیں دیتی تھی، سوائے اس کے جب بعض طبقات پر ظلم وزیادتی ہونے لگے۔

- 'جزیہ علی الرقاب' یا صرف جزیہ کے محصولِ سر ہونے کا فرق عہد نبوی سے موجود تھا اور بعد میں وہ واضح تر ہوتا گیا۔ خراج بالعموم مالیۂ آراضی تھا جو خراجی زمینوں/آراضی سے لیا جاتا تھا۔ خراجی آراضی کا مسئلہ بھی ارتقاء سے جڑا ہوا ہے۔ عہد نبوی میں خراج/خراجی زمین کا غالباً سب سے پہلا واقعہ خیبر کی آراضی کا تھا، جس کی نصف پیداوار پر مفتوح سے صلح ہوئی تھی۔ خیبر کے یہود کی شرائطِ صلح پر ہی اس علاقے کی دوسری بستیوں - فدک، تیماء، وادی القریٰ - نے بھی خراج ادا کیا تھا۔ بعد کے واقعات میں شمالی سرحد کے قریب واقع بستیوں سے خراج کی متناسب مقدار/شرح ایک ربع پیداوار تھی۔ خلافتِ راشدہ میں اسی اصول وسنتِ نبوی پر خراجِ آراضی کی شروح: نصف، ثُلث اور رُبعِ فصل تک طے ہوتی تھی۔ خلافتِ اموی میں اور بعد کی دوسری اسلامی خلافتوں اور ادوار میں ان ہی متناسب شرحوں پر خراجِ زمین متعین کیا گیا تھا اور فقہاءِ کرام نے اپنی

فقہی حد بندیاں- نصفِ پیداوار سب سے زیادہ شرح اور خمسِ فصل سب سے کم شرح- قائم کی تھیں۔ ان تمام واقعات اور معاملات میں واضح ہوتا ہے کہ خراج جنس میں لیا جاتا تھا، نقد میں نہیں، اور ہر فصل پر وصول کیا جاتا تھا۔ سالانہ یا زمانی ادوار کے حساب سے نہیں۔ اور ہر فصل کی مقدار ہی وصول کی جاتی تھی، اس کے بدلے میں دوسری فصل نہیں۔

- معاہداتِ صلح اور دوسری تاریخی شہادتوں سے ایک اور اہم حقیقت اس بارے میں سامنے آتی ہے۔ خراج زمین دار یا کاشت کار پر عائد ہوتا تھا یا آراضی پر، دوسرے الفاظ میں 'خراج علی الرقاب' تھا یا 'خراج علی الارض'؟ اس ضمن میں یہ واضح ہوتا ہے کہ زمینیں یا آراضی خراجی ہوتی تھیں یا عُشری۔ عشری سے یہاں زیادہ بحث نہیں کہ وہ مسلم زمین داروں، کسانوں یا مالکوں سے وصول کیا جاتا تھا اور عشر دراصل زکوٰۃِ مال کی ایک قسم ہے، جو محصول سے زیادہ فریضہ ہے۔ لیکن خراجی آراضی کے عشری آراضی میں تبدیل ہونے کا نتیجہ ان دونوں کے ارتباطِ باہمی کے علاوہ اس مسئلہ سے بھی متعلق ہے۔ قاعدے کے مطابق مسلم خریدار کسی خراجی زمین/ آراضی کو غیر مسلم سے خرید لیتا تھا تو وہ زمین خراجی سے عشری میں تبدیل ہو جاتی تھی۔ حضرت عمر بن خطابؓ نے اصول و قاعدہ جاری کر دیا کہ خراجی آراضی بہر حال خراجی رہے گی، وہ قبضۂ مسلم میں آنے کے بعد عشری نہیں بنے گی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان کثرت سے خراجی آراضی خرید لیا کرتے تھے۔ حضرت عمر ثانیؒ نے خلیفۂ دوم کے احکام وضوابط پر بعض اور احکام ضمنی کا اضافہ کیا اور بعض دوسرے اموی خلفاء نے بھی ایسے احکام جاری کیے جو خلفائے راشدین کی سنت پر مبنی تھے۔

خلافتِ راشدہ میں ریاستی منطقے

خلافتِ راشدہ میں اسلامی ریاست چھ بڑے منطقوں (Division) میں تقسیم کی گئی تھی۔ وہ انتظامی تقسیم بھی تھی اور معاشی/مالی تقسیم بھی۔ ان میں سے ہر ایک منطقہ کے ذیلی صوبے (ولایات) متعدد ہوتے تھے۔ یہ منطقے تھے:۱-سواد (جنوبی عراق)، ۲-الجزیرہ (دو آبۂ دجلہ و فرات)، ۳- شام، ۴- مصر، ۵-خراسان (بشمول ایران و

ایشیائے کوچک)۔۶- منطقہ جزیرہ نمائے عربیہ، جو عہد نبوی میں فتح ہو کر اسلامی ریاست بن چکا تھا۔ اس آخری منطقہ کے تمام معاشی و مالی معاملات کا تعلق عہدِ نبوی سے رہا اور خلافتِ راشدہ میں اس میں ذرا بھی تبدیلی نہ آئی، بقیہ پانچ منطقوں کی فتح خلافتِ راشدہ میں ہوئی، لہٰذا ان کے انتظامی اور معاشی معاملات اسی دور میں متعین ہوئے۔ حضرت عثمانؓ کے عہدِ مبارک سے ان کا وجود ثابت ہونے لگتا ہے جب انھوں نے سات مصاحفِ عثمانی میں سے چھ کو ان ہی چھ منطقوں کے مرکزی/صدر مقام پر بطور رہنما اور اصل متنِ قرآن کریم کے رکھوایا تھا اور انہی سے دوسرے مصاحف تیار کرنے کی اجازت دی تھی۔ باقی تمام مصاحف- ذاتی و سرکاری، کامل و ناقص- کو از راہِ مصلحت تلف فرما دیا تھا۔

ان تمام منطقوں میں معاشی انتظامات ان کی فتح اور صلح و عہد کے لحاظ سے مختلف و متنوع تھے۔ ایسا نہیں تھا کہ وہ ایک دوسرے سے قطعی متصادم و مخالف تھے۔ اصولی طور سے ان سب میں مماثلت و یکسانیت تھی، مگر معاہدات و شرائطِ فتح و صلح کی رنگارنگی نے ان کے مالیاتی معاملات میں تنوّع پیدا کر دیا تھا، جو خاصا معنی خیز ہے۔ مورخینِ اسلامی -طبری، بلاذری وغیرہ- اور فقہائے اسلام- ابو یوسف، یحییٰ بن آدم وغیرہ- نے ان تمام منطقوں کے معاشی/ مالی انتظامات سے مختلف ادوار کے ارتقاء اور مختلف تواریخ کے تنوع کے ضمن میں روایات نقل کی ہیں، جو منتشر ہونے کے سبب ایک متحدہ منظر نامہ پیش نہیں کرتیں، البتہ فقہاء کے ہاں کسی قدر مالیاتی نظام کی بازیافت ملتی ہے۔ مستشرقین میں جولیس ولہاسن (Julius Wellhausen) نے سب سے پہلے اپنی کتاب میں ایک تنقیدی مطالعہ پیش کیا، جسے دوسرے مستشرقین نے بلا نقد قبول کر لیا۔ ڈینیٹ نے البتہ ان تمام پیش روؤں کے نظریات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے۔

سوادِ عراق کا نظامِ مالیات

فقہاءِ اسلام، مورخینِ خلافت اور جدید تحقیقات کے تقابلی مطالعہ سے دو اہم ترین نقطہ ہائے نظر ابھرتے ہیں۔ قدیم اسلامی مصادر اور ان کی تائید میں ڈینیٹ کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ سواد کے چند شہر معاہدے کے مطابق مقررہ رقم خراج یا باج ادا کرتے تھے اور

دوسرے شہروں اور علاقوں سے مسلم حکم رانوں نے باج یا خراج نہیں وصول کیا۔ معاہدہ والے شہروں کا خراج / باج عرب انتظامیہ کی بجائے ان کے باشندوں کے کارکنوں کے ہاتھ میں تھا۔ وہی تشخیص وجمع کرتے تھے۔ اس کے برعکس ولہاسن اور کائتانی کا خیال ہے کہ بیش تر شہر خراج یا مقررہ رقم ادا کرتے تھے۔ مستشرقین کا یہ دوسرا نقطۂ نظر شواہد وحقائق کے خلاف ہے۔ ڈینیٹ نے اس کی خاص طور سے تردید مع دلائل کی ہے۔

۲- اسلامی حکومت وریاست آراضی کی مالک تھی اور سابق مالکان صرف قبضہ کا حق رکھتے تھے۔ خلیفۂ وقت کی اجازت کے بغیر کسی آراضی کی منتقلی مسلم یا غیر مسلم کسی کو بھی نہ ہوتی تھی اور یہ اصول عام نہ تھا۔

۳- آراضی مزروعہ کا مالیہ (خراج) فصل کے مطابق لیا جاتا تھا۔ ہر فصل پر فی اکائی (جریب) پر ایک مقررہ رقم وصول کی جاتی تھی، جو خلیفۂ وقت مقرر کرتا تھا اور وہی اسے تبدیل کرسکتا تھا۔ مختلف فصلوں کا مالیہ مختلف ہوتا تھا۔

۴- آراضی پر جب تک مسلم یا نومسلم قابض رہتا اسے خراج (مالیہ) ادا کرنا پڑتا تھا۔ زمین چھوڑنے ہی پر وہ خراج سے نجات پاسکتا تھا۔ بہت سے غیر مسلم یا نومسلم مالکان نے آراضی چھوڑ کر شہروں کا رخ کیا تھا۔

۵- غیر مسلم جزیہ ادا کرتے تھے اور مالک آراضی ہوتے تو مالیۂ فصل بھی ادا کرتے تھے۔ جزیہ کی رقم / شرح کا تعین ان کی آمدنی کے موافق ہوتا تھا، یعنی اعلیٰ، اوسط اور ادنیٰ شرحوں کے مطابق، جو بالترتیب ۴ دینار، ۲ دینار اور ایک دینار سالانہ ہوتی تھیں۔ اسلام لانے کی صورت میں وہ صرف جزیہ سے مستثنیٰ ہوتا تھا، مالیۂ آراضی سے نہیں۔

۶- معاہدہ والے شہروں میں سے کسی میں سے کوئی کاشت کار مسلم ہوجاتا تو خلیفہ اس کا خراج / باج گھٹا سکتا تھا، لیکن وہ اس میں کبھی اور کسی صورت میں اضافہ نہیں کرسکتا تھا۔

الجزیرہ کا نظامِ محاصل

سوادِ عراق کے بالمقابل جزیرہ (دو آبۂ دجلہ و فرات) پورا کا پورا بزورِ شمشیر فتح

کیا گیا تھا، لہٰذا اس کی تمام آراضی سواد کی خراجی زمینوں کی مانند خراجی تھیں اور اس بنا پر ان کے محاصل بدلے جاسکتے تھے۔ وہاں جن زمینوں پر مسلم کاشت کاروں کو آباد کیا گیا ان کو عشری آراضی میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ یہ عام اصول تھا۔ بہر حال ان تمام آراضی کا نظام بھی تین قسم کے انتظامات کا پابند تھا:

۱- الرھا جیسے شہر اور علاقے فتح کے بعد مسلمانوں کے حوالے کیے گئے۔ لہٰذا وہ صلح آراضی میں شمار ہوئے۔ عربوں نے خلافتِ راشدہ میں صلح آراضی اور خراجی زمینوں میں قدرے فرق رکھا، لیکن اموی عہد میں زیادہ فرق نہیں رکھا گیا۔ صلح آراضی کا انتظام مقامی لوگوں کے ہاتھ میں تھا۔ وہی تشخیص کرتے اور وہی جمعِ محاصل کر کے خزانۂ خلافت میں جمع کرتے تھے۔

۲- خراجی آراضی کا انتظام عرب حکم رانوں کے دیوانوں (دواوین) کے تحت تھا اور وہ سواد کی مانند علاقائی مرکز سے کنٹرول کی جاتی تھیں۔ ان کی تشخیصِ مالیہ اور جمعِ محاصل کا کام خلافت کے افسر کرتے تھے۔

۳- عہد آراضی/ معاہدہ والوں سے خراج/ باج (مقررہ رقم) لی جاتی تھی اور اس میں بیشی وکمی کسی حال میں بالعموم نہیں کی جاتی تھی۔ اضافہ تو بہر حال ممنوع تھا، لیکن آبادی کے بکثرت اسلام لانے یا آراضی کو چھوڑ کر دوسرے علاقوں میں منتقل ہو جانے کی صورت میں مقررہ رقم میں کمی کی جاسکتی تھی اور واقعتاً کی بھی گئی تھی۔

۴- نومسلم جزیہ ادا کرتے اور اسلام لاتے تو جزیہ سے مستثنیٰ ہو جاتے۔ خلافتِ راشدہ میں ایک دینار جزیہ فی کس مقرر تھا اور خلیفہ عبدالملک کی اصلاح کے بعد چار دینار ہو گیا تھا۔ لیکن اگر وہ آراضی کے مالک ہوتے تو ان کو مالیہ ادا کرنا پڑتا تھا۔ اسلام لانے سے مالیہ آراضی معاف نہیں ہوتا تھا۔

شام کا نظامِ محاصل

جزیرۂ عراق اور شام دونوں علاقوں میں بازنطینی/ رومی بلدیاتی نظام اسلامی فتح سے قبل موجود و مستحکم تھا۔ مسلمان فاتحین کو بیش تر ان بلدیاتی نظامات سے بعد یا قبلِ فتح معاملہ کرنا پڑا تھا، لہٰذا دونوں کا اسلامی نظامِ محاصل قریب قریب یکساں تھا۔ شام کی اسلامی

فتح کے ضمن میں بھی فتح کی نوعیت کے مطابق مالی انتظامات تبدیل ہوئے تھے۔ مثلاً جن شہروں، علاقوں نے مزاحمت کے بغیر صلح یا عہد کرلیا تھا ان کی آراضی کی نوعیت اور محاصل کی فطرت الگ تھی، وہ صلح یا عہد آراضی تھیں۔ لیکن جن علاقوں نے مزاحمت کے بعد حوالگی کی تھی ان کی صلح کی شرائط مختلف تھیں اور اسی طرح بزور فتح کی گئی آراضی خالص خراجی زمینیں تھیں جن پر مالیہ خلافت کے افسران خلیفہ کے حکم سے مقرر کرتے تھے۔

۲- متروکہ آراضی خلافتِ اسلامی کی ملکیت وانتظام میں آ گئی تھیں۔ ان میں اقطاعات/ قطائع دیے گئے۔ حضرت عمرؓ کے عہد میں بھی اور خلافت عثمانؓ و معاویہؓ کے ادوار میں بھی۔ فوجی چھاؤنیوں کے فوجیوں کے گذارے کے لیے ان کی تنخواہ کے بقدر چھوٹے بڑے قطائع دیے گئے۔ عہد نبوی میں قطائع ذاتی جائدادیں بن جاتی تھیں جو بطور انعام عطا ہوتی تھیں۔

۳- بعض شہروں اور قلعوں نے ایک/ اولین حوالگی و صلح کے بعد بغاوت کردی اور دوسری بار یا متعدد بار ان کو بزور فتح کیا گیا۔ ان کے معاہدات کی شرائط الگ الگ ملتی ہیں۔ مثلاً حمص شہر نے تین بار معاہداتِ صلح کیے اور دمشق نے دوبار۔ لہٰذا ان کے آخری معاہدے کی شرائط اولین یا گذشتہ معاہدوں سے کافی مختلف تھیں۔

۴- حضرت عمرؓ نے مردم شماری کرائی اور زمین، جانوروں اور کھجور کے درختوں وغیرہ کا حساب تیار کرایا۔ آغازِ خلافت میں مالکانِ اقطاعات/ قطائع کسانوں سے محاصل جمع کر کے حکومتِ اسلامی کو ادا کرتے تھے۔ حضرت معاویہؓ کی اصلاحات کے بعد کاشت کار براہ راست تمام محاصل ادا کرنے لگے اور مالکانِ آراضی کا واسطہ ختم ہوگیا۔

۵- نومسلم صرف جزیہ سے مستثنیٰ ہوتا تھا۔ جزیہ کی سہ گانہ درجہ بندی حضرت عمرؓ کے زمانے میں کی گئی، جو فی کس چار دینار دولت مندوں کے لیے تھی اور دو یا ایک دینار اوسط اور کم آمدنی والوں کے لیے تھی۔

مصری نظامِ مالیات

اسلامی نظامِ مالیات کے عام اور مقررہ اصول کے مطابق مصر کی فتح مکمل

ہونے پر محاصل کے چار نظام موجود تھے:

۱- قبطیوں سے معاہدات کے تحت ہر بالغ اور صحت مند قبطی مرد کو دو دینار نقد اور ایک دینار فی فدان جزیہ ادا کرنا اور ہر پیداوار کا ایک مقررہ حصہ حکومت کو دینا ہوتا تھا۔ یہ یک مشت خراج نہ تھا، بلکہ تشخیصِ محاصل کی ایک شرح تھی۔

۲- اسکندریہ بزور فتح ہونے کی بنا پر خراج کی آراضی تھی اور اس کا انتظام مسلم حکومت کی مرضی پر موقوف تھا۔

۳- پینٹا پولیس جیسے شہر عہد علاقے تھے اور ان پر سالانہ مقررہ رقم عائد کی گئی تھی، جو گھٹائی بڑھائی نہیں جا سکتی تھی۔

۴- سرکاری آراضی اور اقطاعات/ قطائع براہ راست سرکاری خزانے میں اپنے محاصل جمع کرتے تھے۔

یہ تمام زمینی اصلاحات فاتحِ مصر حضرت عمرو بن العاص سہمیؓ نے نہیں کی تھیں، بلکہ ان کے جانشین حضرت عبداللہ بن سعد بن ابی سرح عامریؓ کی جاری کردہ تھیں۔ یہ انتظامات ان کے عہدِ امارت ۶۲۶ - ۶۳۵ء کے دوران میں رہے۔ انھوں نے درمیانی واسطوں/ گماشتوں کا سلسلہ ختم کر کے باقاعدہ زمینی پیمائش کرنے کے بعد اور ان کی دہ سالہ پیداوار کا تخمینہ نکال کر اس کے اوسط پر محاصل عائد کیے تھے۔ انھوں نے پورے ملک مصر کے لیے دو دیوان بنائے تھے: ایک مصرِ بالا کے لیے اور دوسرا مصرِ زیریں کے لیے۔ ان کے نظام میں قدیم یونانی / رومی انتظامی اکائی پیگارک سب سے بڑی تھی۔ اور اسلامی نظام میں اس کے مالی اختیارات بہت وسیع تھے۔ اس میں تمام دیہات، گرجے، خانقاہیں اور چھوٹے تعلقے شامل تھے۔ اکائی کا منتظم پیگارک براہ راست عرب/مسلم گورنر سے معاملات طے کر لیتا تھا۔ اس کے تحت نو مسلم صرف جزیہ سے مستثنیٰ ہوتا تھا اور غیر مسلم جزیہ کے علاوہ فصل کا مالیہ اور اس کا ایک حصہ جنس میں ادا کرتا تھا۔ یہ کافی مفصل اور واضح اور راست نظام تھا جس نے حکومت کے محاصل میں اضافہ تو کیا ہی کسانوں اور اہلِ مصر کی معاشی حالت بھی سدھار دی۔

خراسان کا نظامِ محصولات

خراسان کی فتح دوسرے مقبوضہ ممالک کی مانند ان ہی تین طریقوں- بزورِ فتح، صلح، عہد- کے ذریعہ ہوئی تھی۔ ان کے محاصل تجارت، صنعت وحرفت اور زراعت سے الگ الگ حاصل کیے جاتے تھے اور دوسرے زرعی محاصل بھی تھے۔ کاشت کاروں سے مالیۂ آراضی وصول کیا جاتا تھا اور غیر مسلموں سے جزیۂ سر بھی لیا جاتا تھا۔ اسلام لانے پر صرف جزیہ سے راحت ملتی تھی، مالیہ/خراجِ آراضی سے نہیں۔ محصولِ سر (جزیہ) ہر بالغ مرد کی آمدنی کے مطابق لیا جاتا تھا۔ عہد آراضی/علاقوں سے سالانہ خراج/باج کی مقررہ رقم لی جاتی تھی۔ ان کی ایک دلچسپ تفصیل حضرت عبداللہ بن عامر بن کریز عبشمیؓ کے ایک معاہدہ سے ملتی ہے۔

۱- طبسان- ساٹھ ہزار درہم
۲- قہستان- چھ لاکھ درہم
۳- نیشاپور- دس لاکھ درہم
۴- نسا- تین لاکھ درہم
۵- ابی ورد- چار لاکھ درہم
۶- طوس- چھ لاکھ درہم
۷- ہرات- دس لاکھ درہم
۸- خاتونِ بخارا- دس لاکھ درہم
۹- سمرقند- سات لاکھ درہم

مروالشاہجاں اور دوسرے شہروں نے بھی اسی طرح کے معاہدے کیے تھے۔ ان میں سے بعض نے نقد کے علاوہ جنس میں بھی کچھ حصۂ فصل ادا کرنے کا عہد کیا تھا۔ ان تمام شہروں اور علاقوں نے یہ معاہدے اپنے بلدیاتی کارکنوں کے ذریعے کیے تھے یا رئیسوں، حکمراں اور امیروں کے ذریعہ۔ اس طرح پورا خراسان 'عہد' بن گیا تھا۔ ان کے باشندے اپنے خراج باج کی رقم خود ہی جمع کر کے مقررہ خراج سالانہ ادا کرتے تھے۔ اور ان کی بیش تر آراضی خراجی آراضی نہیں بن پائی تھیں۔ حسب دستور اسلام قبول کرنے پر نومسلم کاشت کار مالکِ آراضی صرف جزیۂ سر سے مستثنیٰ ہوجاتا تھا، مالیۂ آراضی سے نہیں۔ اسے وہ حسبِ سابق ادا کرتا رہتا تھا کہ وہ اصلاً محصولِ آراضی/فصل تھا اور اس کا تعلق مذہب سے نہ تھا۔ ڈینیٹ نے اسلامی مصادر کے بیانات کی تصدیق کی ہے اور

ولہاسن اور بیکر وغیرہ کے نتائج واستنباطات کی تردید کی ہے جن کے مطابق اسلام لانے پر نومسلم تمام محاصل کے بوجھ سے نجات پالیتا تھا اور ان کے اسی خیال خام کے مطابق یہی اقتصادی محرک ان کے اسلام لانے کا سبب بنا تھا۔ ڈینیٹ نے اس کی تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ اشاعتِ دین میں اقتصادی محرک تھا ہی نہیں، کیونکہ نومسلم صرف جزیہ سے راحت پاتا تھا اور جزیہ بہت معمولی محصول تھا۔

مختصر تجزیہ

سطور ذیل میں سابقہ مباحث کی تحلیل کے علاوہ بعض خاص جہات وابعاد کو نکات کی شکل میں پیش کیا جارہا ہے:

۱- یہ مطالعۂ نظامِ محاصل اسلامی اور استشراقی دونوں مصادر ومآخذ پر مبنی ہے۔ اسلامی مصادر میں مورخینِ اسلام کے بیانات وروایات کے علاوہ ایک نئے مصدر وماخذ پیپری دستاویزات (Papyri Records) کو بھی اہل علم اور بالخصوص علماء اسلام سے متعارف کراتا ہے جو نئی آگاہی پر مبنی ہے۔ یہ پیپری دستاویزات حضرت عمرؓ کے زمانے سے ملنا شروع ہوتی ہیں اور پورے اسلامی دورِ خلافت سے متعلق ملتی ہیں۔ اس طرح وہ معاصر دستاویزات ہیں اور بالعموم دولسانی ہیں، یعنی عربی اور مقامی زبان قبطی میں ہیں۔ وہ اکثر وبیش تر مصری علاقے سے متعلق ہیں۔ فاتحین اسلام، گورنروں اور عمالِ منطقات نے ان کو بطور معاہدات وسرکاری دستاویزات تیار کیا تھا اور خلفائے وقت نے ان کو صدر مقام سے کبھی کبھی خالص عربی میں ارسال فرمایا تھا۔ یہ ہزاروں کی تعداد میں ہیں اور ان میں سے صرف چند سو ابھی تک مستشرقین ہی کی انتھک محنت سے منظرِ عام پر آسکی ہیں۔ غیر اسلامی-عیسائی-دستاویزات اور استشراقی مطالعات دوسری قسم کے مآخذ ہیں جن تک عام اہل علم کی رسائی ہے نہ اہلِ اسلام کو ان سے آگاہی ہے۔ ان کا شمول بھی مصدری معیار کو بلند ومستحکم تر کرتا ہے۔ منتخب کتابیات سے جو محقق ڈینیٹ نے دی ہے اس قیمتی مصدری اثاثہ کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

۲- مستشرقین میں جولیس ولہاسن (Julius Wellhausen) نے 'دولت

عربیہ اور اس کا سقوط' (The Arab Kingdom & its Fall) (انگریزی ترجمہ، لندن ۱۹۷۳ء، اصل کتاب جرمن میں ہے) میں معاشی عوامل کے کارفرما ہونے کا خاص نظریہ پیش کیا۔ اس کے دوسرے سیاسی نکات کی طرح یہ معاشی نکات بھی مسلمہ حقیقت مان لیے گئے اور بعد کے مستشرقین نے ان ہی پر اپنے نظریات وافکار معمولی سی ترمیم کے بعد استوار کیے۔ محقق ڈینیٹ نے ان کے تمام سیاسی اور معاشی نظریات وافکار سے بحث کی ہے اور ان میں سے بیش تر کو مسترد کر دیا ہے، کیونکہ وہ خالص اسلامی مصادر کے علاوہ پیپری ریکارڈز اور دوسرے غیر اسلامی - عیسائی - دستاویزات کے بھی خلاف ہیں۔

جولیس ولہاسن کے علاوہ دوسرے مستشرقین جن کے افکار سے بحث کی ہے یہ ہیں: (۱) سی، ایچ بیکر (C.H.Becker)، (۲) ایچ آئی بیل (H.I.Bell)، (۳) میکس فان برخم (Max Van Berchem)، (۴) لیون کیتانی / کائتانی (Leon Caetani)، (۵) آر، ایچ، چارلس (R.H. Charles)، (۶) آرتھر کرسٹنسن (Arther Christensen)، (۷) بی، ٹی، اے، ایوٹس (B.T.A. Evetts)، (۸) میتھائس گلزر (Matthias Gelzer)، (۹) فرڈی نینڈ لاٹ (Ferdinand Lot)، (۱۰) ٹی نوئلڈ کے (T. Noeldede)، (۱۱) جرمین راؤلارڈ (Germaine Rouillard)، (۱۲) اولرخ ولکن / ایل میٹیز (Ulrich Wilchen & L. Mitters)۔

ان کے علاوہ پیپری ریکارڈز کے حوالے سے بعض اور مستشرقین کی خدمات ونظریات کا حوالہ دیا ہے، جیسے اڈولف گروہ مان (Adol Grohmann)، ہنری لامنز (Henry Lammens)، مارٹن ہارٹ من (Martin Hartmann)، اے ایس ٹرٹن (A.S. Tritton)، نابیہ ایبٹ (Nabia Abbott)، مارٹن اسپرنگلنگ (Martin Sprengling)، اے این پولیاک (A.N. Poliak)، نکولس پی آگنیڈز (Nicholas P. Aghnides)، فان کریمر (Van Kremer)، ویل (Weil)، ڈوزی (Dozy)، اور بعض دوسرے مستشرقین اور ان کے ہم نوا۔

۳- مصادر و مآخذ اور ان پر مبنی استنباطات و نتائج سے بحث و مقابلہ کا تیسرا

زاویہ ہے جو معاشی/ مالی اصطلاحات کی تنقیح سے متعلق ہے۔ اس کی دو سطحیں ہیں:

اول سطح یہ ہے کہ جزیہ، خراج بمعنی باج (Tribute) اور خراج/ مالیہ آراضی وغیرہ کی تشخیص اور ان کے معانی کی تعیین ہے۔ جدید تحقیق نے اسلامی مصادر کی تائید و توثیق کرتے ہوئے وضاحت کی ہے کہ:

- جزیہ محصولِ سر تھا جسے 'جزیہ علی الرقاب' بھی کہا جاتا ہے اور وہ غیر مسلم رعایا میں سے صرف مرد، بالغ اور صاحب مال سے لیا جاتا تھا۔ بلا آمدنی والے افراد و طبقات جیسے بوڑھے، عورتیں، بچے اور مذہبی افراد وغیرہ اس سے مستثنیٰ تھے۔

- خراج بمعنی باج وہ مقررہ رقم تھی جو اسلامی فاتحین نے کسی شہر، قلعہ یا علاقے کی فتح کے بعد وہاں کی آبادی پر عائد کی تھی۔ یہ مقررہ رقم تمام محاصل کو شامل تھی اور اس کے علاوہ دوسرا کوئی محصول یعنی جزیہ یا مالیہ نہیں لیا جاتا تھا اسے اس شہر و علاقے کے لوگ اپنے نمائندوں/ حاکموں کے ذریعہ جمع کر کے ادا کرتے تھے۔ اسلامی حکومت اس کی تشخیص و جمع میں دخل نہیں دیتی تھی، تاہم وہ بے انصافی اور ظلم کا تدارک کرنے کی پابند تھی اور اس پر نظر رکھتی تھی۔

- مالیۂ آراضی/ 'خراج علی الارض' مزروعہ زمینوں پر عائد ہوتا تھا اور ان کے مالکوں/ قابضوں سے لیا جاتا تھا۔

دوسری سطح ان محاصل کی تاریخ ترقی یا ان کے نظام کے ارتقاء سے متعلق ہے، جس کا ادراک نہ ہونے کے سبب مستشرقین نے بالخصوص اور دوسرے اہلِ علم نے بالعموم غلطیاں کی ہیں۔ ان میں مسلم علماء بھی شامل ہیں:

- جزیہ بلاشبہ پستی یا محکومیت کا نشان تھا جو اسلامی خلافت سے قبل کے ادوار سے چلا آ رہا تھا اور وہ بازنطینی/ رومی اور ایرانی/ ساسانی دونوں نظاموں کے تحت ان کے علاقوں میں جاری رہا تھا۔

- اسلامی نظامِ معیشت میں جزیہ کا تصور و عمل ان ہی سابقہ نظاموں سے آیا تھا، البتہ مسلمانوں نے ان کی تشخیص و جمع میں خاصی ترمیم کی تھی اور اسے غیر مسلموں کی

حفاظت اور اسلامی حکومت میں رہائش کا محصول بنا دیا تھا اور جو صرف مستطیع لوگوں پر عائد ہوتا تھا اور جان و مال و آبرو کی حفاظت نہ ہونے کی صورت میں وصول نہیں کیا جاتا تھا، یا وصول کر لیا گیا تو واپس کر دیا جاتا تھا، جیسا کہ فتحِ دمشق کے بعد کیا گیا تھا۔

- جزیہ اور اس کی شرحوں کے ارتقاءِ تاریخی کا مطالعہ بھی بہت دلچسپ ہے جو خاصی تفصیل چاہتا ہے۔ مختصراً یہ کہا جا سکتا ہے کہ اصلاً جزیہ صرف اہلِ کتاب سے لیا جا سکتا تھا، جیسا کہ سورۂ توبہ-۲۹ میں ہے۔ لیکن رسولِ اکرم ﷺ نے مشرقی دیارِ عرب کی فتح و الحاق کے بعد وہاں کے مجوسی افراد و طبقات سے بھی جزیہ وصول کیا، لہٰذا وہ اسلامی ریاست میں آباد تمام غیر مسلم طبقات کی حفاظت وصیانت کا محصول بن گیا اور اس میں تمام اہلِ کتاب یا شبہِ اہلِ کتاب یا مجوس و کفار بھی شامل ہو گئے۔ صرف اہل کتاب کی شرط باقی نہیں رہی تھی۔

- عہدِ نبوی میں جزیہ کی شرحِ عام بالعموم ایک دینار فی بالغ مرد/کس تھی۔ بعد میں اس میں ارتقاء ہوا۔ خلافتِ فاروقی و عثمانی میں میں دو دینار اور چار دینار کی دو اور شرحیں بھی ملتی ہیں۔ روایات کے مطابق خلیفۂ دوم نے سہ گانہ شروحِ جزیہ کا سلسلہ شروع کیا، جو خلافتِ عبدالملک میں باقاعدہ اور مستحکم نظام بن گیا۔

- نقد رقم کے علاوہ بعض علاقوں سے جزیہ میں فصلوں کا خاص مقررہ حصہ بھی لیا جاتا تھا۔ یہ جزیہ جنس تھا۔ وہ مسلم فوجیوں کی غذا اور رہائش اور ان کی ضروریات کی تکمیل کے لیے لیا جاتا تھا اور اس کی ابتدا بھی عہدِ نبوی میں ہوئی تھی، جب آپ ﷺ نے مفتوحہ/مقبوضہ علاقوں کے لوگوں سے اس کا مطالبہ اپنے فرامین میں کیا تھا۔ بسا اوقات ان سے اسلحہ اور لباس وغیرہ مستعار لینا بھی اس کا ایک جزو بنایا گیا تھا۔

- مستند و معیاری شروحِ جزیہ (نقد) یہ تھیں: ۱-چار دینار یا اڑتالیس درہم سالانہ مال داروں سے۔ ۲-دو دینار یا چوبیس درہم سالانہ اوسط آمدنی والوں سے اور ۳-ایک دینار یا بارہ درہم سالانہ کم ترین آمدنی والوں سے۔ حضرت عبدالملک امویؒ کے زمانے میں ان شرحوں کو بالکل معیاری بنا دیا گیا۔ لیکن اس سے قبل عہدِ نبوی سے

خلافت فاروقی وعثمانی اور خلافت معاویہؓ میں اس نظام کا ارتقاء وتکمیل ہوتی رہی تھی۔ اموی خلیفہ کے عہد میں دینار اور درہم کی شرح تبادلہ کو معیاری بنایا گیا، یعنی ایک دینار میں بارہ درہم کی شرح مقرر کی گئی۔ اس سے قبل تبادلہ کی شرح مختلف ادوار اور مختلف علاقوں میں مختلف تھی، کیونکہ دینار و درہم کا وزن مقرر و مستند نہ تھا جو خلافت عبدالملک میں معیاری بن گیا۔ کیونکہ اس عہد میں سکّے خالص اسلامی ٹکسالوں (دار الضرب) میں ڈھالے جاتے تھے اور یکساں ہوتے تھے۔

- خراج/باج (Tribute) کا ارتقاء فتحِ حیرہ سے شروع ہوا اور برابر پورے دور میں جاری رہا۔ حیرہ والوں نے اسلامی فاتح حضرت خالد بن ولید مخزومیؓ سے شہر کی حوالگی ساٹھ ہزار یا ایک لاکھ درہم سالانہ کی مقررہ رقم پر کی تھی۔ اس کے بعد متعدد دوسرے شہروں نے اس کی تقلید کی اور تحقیق کے مطابق خراسان تو پورا ہی عہد آراضی تھا۔ جس مقررہ رقم پر طرفین میں معاہدہ ہو جاتا تھا اس میں اسلامی ریاست کبھی اضافہ نہیں کر سکتی تھی، البتہ اشاعتِ اسلام یا آبادی کی کمی وغیرہ کے سبب اس میں کمی کر سکتی تھی۔ یہ اصلاً سماجی انصاف کے اصول کی کارفرمائی تھی۔ ایسے تمام علاقوں اور شہروں سے صرف باج ہی وصول کیا جاتا تھا اور کچھ نہیں۔

- خراج/مالیہ آراضی ان آراضی یا مفتوحہ علاقوں سے وصول کیا جاتا تھا جو صلح یا بزور فتح کی بنا پر اسلامی ریاست کی ملکیت بن گئی تھیں۔ ان سے ہر فصل پر یا تو متناسب مالیہ یعنی ۱/۲، ۱/۳، ۱/۴، ۱/۵ لیا جاتا تھا، یا آراضی کی پیمائش کر کے فی جریب خراج/مالیہ مقرر کیا جاتا تھا اور وہ فصلوں کی نوعیت و قیمت کے لحاظ سے مختلف ہوتا تھا، یعنی قیمتی فصلوں میں فی جریب زیادہ خراج اور عام فصلوں میں نسبتاً کم خراج۔ اس کی تفصیل مآخذ میں ملتی ہے۔

- آراضی کی پیمائش کا سلسلہ حضرت عمرؓ کے زمانے سے شروع ہوا اور حضرت عثمانؓ کے زمانے میں اس میں کافی ترقی ہوئی اور بالآخر خلافتِ معاویہؓ میں اس کو ایک باقاعدہ نظام کی شکل دے دی گئی۔ ان تینوں ادوارِ خلافت میں آراضی کی پیمائش اور اس

کے طریقوں کا ارتقاء ایک اہم مطالعہ بن سکتا ہے۔

- جن آراضی اور جائدادوں کے مالکان اسلامی فتح کے بعد بھاگ گئے تھے یا وہ سابق حکم رانوں کی جائدادیں تھیں وہ سب کی سب فے آراضی بن گئیں اور ان کی دیکھ بھال، زراعت، تشخیص و جمع وغیرہ سب کچھ براہ راست اسلامی خلافت کے افسروں کی نگرانی میں آ گئی۔ اسی میں سے اقطاعات / قطائع دیے گئے، یعنی افسروں کو زمین کی جائداد بطور تنخواہ۔ یہ سلسلۂ قطائع عہدِ نبوی سے شروع ہوا اور تمام ادوارِ خلافت میں جاری رہا۔ خلافت عثمانی سے ان کی تعداد میں اضافہ ہوا۔ عطائے قطائع کی قلت اور کثرت ایک جزوی انتظامی اور مالی معاملہ ہے، اصل قطائع کا عطیہ ہے۔

- ان تمام اصلاحات وارتقاءات کے نتیجے میں مفتوحہ آراضی کی چار قسمیں ہوگئیں:

(الف) بزورِ فتح کی گئی آراضی خراجی تھی جس کا خراج اسلامی حکومت اپنی مرضی سے مقرر کرتی تھی۔

(ب) صلح کے ذریعہ فتح ہوئی آراضی پر صلح کی شروط کے مطابق مالیۂ آراضی لگتا تھا، جس میں اسلامی ریاست کمی بیشی دونوں کر سکتی تھی اور کرتی تھی۔

(ج) عہد آراضی میں اسلامی حکومت صرف مقررہ خراج کی رقم وصول کرتی تھی اور اس میں اضافہ نہیں کر سکتی تھی، البتہ اس میں کمی کر سکتی تھی۔ اصلاً اس کو باج یا Tribute کہنا چاہیے۔

(د) فے آراضی کی ملکیت و قبضہ دونوں اسلامی ریاست کے ہاتھ میں ہوتا تھا اور اس کی تمام آمدنی بھی اسی کی ہوتی تھی۔

ولہاسن اور دیگر پیش رو مستشرقین نے جزیہ اور خراج / مالیہ آراضی میں فرق نہیں کیا اور خاصا خلطِ مبحث کیا ہے۔ محقق ڈینیٹ نے اس ضمن میں بعض اور اہم حقائق کو آشکار کیا ہے:

- جزیہ یعنی محصولِ سر اور خراج یعنی مالیہ آراضی میں ہمیشہ فرق رہا، جیسا کہ

اسلامی مصادر بیان کرتے ہیں۔خواہ وہ کبھی کبھی دونوں کو متبادل محصول کے طور پر بھی استعمال کرتے ہیں،لیکن سیاق وسباق دونوں کا امتیاز واضح کر دیتا ہے۔

- اسلام لانے پر صرف جزیہ سے نومسلموں کو راحت ملتی تھی، مالیہ آراضی/خراج سے نہیں، اس سے چھٹکارا صرف آراضی چھوڑ دینے پر حاصل ہوسکتا تھا۔نومسلموں کا معاف کردہ جزیہ باقی غیر مسلموں پر نہیں لگایا جاتا تھا۔

- خراجی زمین کو عشری زمین میں بدلنے کی اجازت نہیں تھی۔دراصل انتقالِ آراضی خلیفۂ وقت کی اجازت کے بغیر ممکن نہ تھا۔اور خلیفہ بہت کم آراضی کے انتقال کی اجازت دیتا تھا۔

- مسلمانوں نے جب خراجی آراضی کی خرید شروع کی اور ان کو عشری آراضی میں تبدیل کرنے کا آغاز کیا تو خلیفۂ دوم نے یہ قاعدہ نافذ کیا کہ خراجی زمین خراجی ہی رہے گی، مسلم قبضہ میں آنے کے بعد بھی وہ عشری نہیں بن سکے گی۔حضرت معاویہؓ اور دوسرے اموی خلفاءِ وقت بالخصوص حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے اس حکم و قاعدہ کو اور بھی مستحکم کر دیا۔اس قاعدہ کی بنا پر انتقالِ آراضی کا سلسلہ رک گیا اور خراجی زمینوں سے حاصل کردہ محاصل حسب سابق جاری رہے۔

- مورخینِ اسلام اور فقہائے عصر نے جن احکام وقواعدِ آراضی کے اجراء کا انتساب خلیفۂ دوم یا ان کے جانشینوں کے نام کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے۔مستشرقین کا یہ الزام کہ بعد کے حکمراں یا فقہاء ان کا انتساب خلیفۂ دوم یا کسی اور خلیفۂ راشد کی طرف غلط طور سے محض دینی و قانونی استناد حاصل کرنے کے لیے کر دیتے تھے، قطعی غلط ہے۔

- محقق ڈینیٹ نے ایک اور اہم ترین تحقیق یہ پیش کی ہے کہ مصادرِ اسلامی کے بظاہر متضاد ومتصادم بیانات وروایات دراصل مختلف احوال کے بیانات ہیں۔ مثلاً حمص کے بارے میں تین چار متضاد روایات ملتی ہیں۔ اسی طرح بعض دوسرے شہروں کے بارے میں متصادم بیانات نقل کیے جاتے ہیں۔ وہ در اصل متضاد و متصادم نہیں ہیں، بلکہ وہ مختلف زمانوں اور معاملوں سے متعلق روایات و بیانات ہیں۔ان کو جب ان کے صحیح تاریخی تناظر میں رکھا جاتا ہے تو ان کا تضاد و تنافر دور ہوجاتا ہے۔ یہ در اصل صحیح

اسلامی تاریخی تناظر میں روایات کے مطالعہ وافہام کا معاملہ ہے۔ اس کی ایک مثال بہت عبرت انگیز ہے اور مسلم اصحاب قلم کے لیے بطور خاص غور کرنے کے لائق ہے۔

فاتحِ مصر حضرت عمرو بن العاص سہمیؓ سے خلیفۂ سوم حضرت عثمان غنیؓ نے مصری محاصل کی کمی کا شکوہ کیا اور ان کے بڑھانے کی حکمت بیان کی، مگر انھوں نے معذرت کر لی۔ حضرت عثمانؓ نے تجویز رکھی کہ گورنری کا کام حضرت عمروؓ دیکھیں اور 'خراج' کے وصول وانتظام کی ذمہ داری حضرت عبداللہ بن سعد عامریؓ کے حوالے کر دیں۔ اس پر فاتحِ مصر کا مشہور جملہ مصادر میں نقل کیا جاتا ہے کہ ''گائے کے سینگ میں پکڑوں اور دودھ اس کا کوئی اور دوہے''۔ خلیفۂ راشد نے بہر حال حضرت عمر فاروقؓ کی پالیسی کے مطابق حضرت عبداللہ بن سعد عامریؓ کو دونوں ذمہ داریاں سونپ دیں۔ ایک دو سال کے بعد ہی مصر کے محاصل اتنے بڑھ گئے کہ وہ نہ صرف اپنے مقامی اخراجات پورے کرنے لگے بلکہ مرکزی بیت المال کے لیے مدینہ منورہ آنے لگے۔ حضرت عثمانؓ نے حضرت عمرو بن عاصؓ کو صورتِ حال بتائی تو ان کا تبصرہ تھا کہ ''ہاں بچھڑا بھوکا رہ گیا''۔ مسلم اہلِ قلم اس کو خوب بیان کرتے ہیں اور حقیقت سے غافل ہیں۔ اس کا عقدہ دراصل پیپری دستاویزات نے کھولا۔ ان کے مطابق حضرت عبداللہ بن سعدؓ نے اصلاحات کر کے بچولیوں کو نکال دیا تھا اور صحیح محاصل حاصل کر لیے تھے۔

- مجموعی تناظر میں روایات وآثار کے تجزیہ کے طریقِ بحث نے بعض اور اہم اور دلچسپ نتائج تک پہنچایا ہے جن سے عام مسلم اہلِ قلم بے خبر ہیں۔ ان کی بے خبری عدمِ واقفیت سے زیادہ عدمِ تحلیل کی بنا پر ہے۔

- سوادِ عراق کے نومسلموں پر جزیہ عائد کرنے کی بدعت کا الزام بالعموم حضرت حجاج بن یوسف ثقفیؒ پر لگایا جاتا ہے۔ محقق ڈینیٹ نے بھی والیِ عراق کو زیادتی کا مجرم قرار دیا ہے جس طرح عام مورخین قرار دیتے ہیں۔ لیکن اس کے پیچھے ایک گہری سیاسی، انتظامی اور مالی و معاشی حکمتِ عملی کارفرما تھی جس کا ادراک محققین نے کیا ہے۔ خراج/مالیۂ آراضی کے محاصل کے بوجھ سے چھٹکارا پانے اور شہری زندگی کی نعمتوں سے لطف اندوز ہونے کی خاطر اس علاقے کے کاشت کاروں نے اپنی مزروعہ آراضی چھوڑ کر

شہروں کو بالخصوص کوفہ و بصرہ کا رخ کیا تھا۔ اس سے زراعت کو شدید نقصان پہنچنے کے علاوہ شہروں میں انتظامی اور اقتصادی مسائل پیدا ہو گئے تھے، جن سے حکومت مضطرب تھی۔ حضرت حجاج نے اس کا حل یہ نکالا کہ تمام کاشت کاروں اور زمین داروں کو ان کی مزروعہ آراضی سے باندھ دیا کہ وہ کسی طور پر ان کو نہیں چھوڑ سکتے اور شہروں میں فساد پیدا کرنے والوں کو واپس ان کی زمینوں پر بھیجا اور بطور تعزیر ان پر جزیہ بھی عائد کر دیا۔ یہاں سے نومسلموں/نومسلم کاشت کاروں پر جزیہ کا غیر اسلامی بوجھ شروع ہو گیا۔ اگرچہ ابھی تک تحقیق نہیں ہو سکی، مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جزیہ سے مراد جزیہ علی الارض/ مالیۂ آراضی ہی تھا۔ مالیۂ آراضی/خراج کے علاوہ محصول سر/ جزیہ خالص بہر حال ایک زیادتی ہے، جو بطور تعزیر بھی قابلِ دفاع نہیں ہے۔

- دوسرے مشرقی امصار و دیار بالخصوص خراسان میں نومسلموں کو اسلام لانے کے باوجود بسا اوقات بعد کے عہد میں جزیہ سے مستثنیٰ نہیں کیا گیا، لیکن اصلاح پسند گورنروں الاشرس (۱۱۰ھ/ ۷۲۸ء کے زمانے میں) اور آخری اموی گورنر نصر بن سیار (۱۲۱ھ/ ۷۳۸ء کے زمانے میں) وغیرہ نے اپنی معاشی اصلاحات کے نتیجہ میں نومسلموں کو جزیہ سے مستثنیٰ کرنے کا اعلان کیا اور ان کو اسلامی حقوق سے نوازا، جس کے خوش گوار نتائج برآمد ہوئے۔ اگرچہ ان اصلاحات کو بسا اوقات تلپٹ کرنے والوں نے بے خبری سے زیادہ حماقت کا ثبوت دیا اور بغاوت کو فروغ دیا۔

- نومسلموں پر جزیہ لگائے رکھنے کے جرم میں اگر بعض مسلم گورنر اور عمال ماخوذ کیے گئے ہیں تو ان سے زیادہ مقامی غیر مسلم بلدیاتی اور علاقائی عمال اور کارکن ذمہ دار تھے، جن کے بارے میں محقق ڈینیٹ نے پختہ ثبوت فراہم کیا ہے۔ یہ مقامی غیر مسلم افسر اپنے ہم قوم اور ہم مذہب لوگوں کو خراج کے بوجھ سے بچانے اور نومسلموں کو اسلام لانے پر سزا دینے کے لیے حسب سابق جزیہ بحال رکھتے تھے اور عام احکام کے باوجود نومسلموں کو اس سے راحت نہ دیتے تھے۔ اسلامی مصادر میں بار بار مختلف ادوار کے حوالے سے نومسلموں کو جزیہ سے مستثنیٰ رکھنے کی خبریں اسی بنا پر ملتی ہیں۔ (جزیہ اور اسلام، ۲۰۶ حاشیہ مترجم ہے: خراسان میں بہت سے مجوسیوں، مسیحیوں اور یہودیوں نے

...نومسلموں پر سختیاں کیں اور ان پر محاصل کا بوجھ بڑھایا۔ اس کے برعکس اپنے مذہبوں کو فائدہ پہونچایا۔ اسی طرح مصر کے قبطی مسیحیوں نے کیا...)

- مفتوحہ ممالک میں اسلام کی اشاعت کے واقعات اور بعض گورنروں، خلفاء اور عمال کی کوششوں کا بھی ذکر خاصا اہم ہے۔ عام خیال یہ ہے کہ عرب حکمرانوں بالخصوص اموی عمال وخلفاء کو اشاعتِ دین سے زیادہ محاصل کی وصولی سے دلچسپی تھی۔ محققِ موصوف نے بھی بعض صورتوں میں اس خیالِ عام کو قبول کیا ہے، تاہم گورنر خراسان الاشرس کی مساعیٔ تبلیغ کا بھی اعتراف کیا ہے۔ انھوں نے ایک متقی مولیٰ حضرت ابوالصیداء صالح بن ظریفؒ کے ذریعہ سمرقند وغیرہ کے علاقوں میں غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کی ایک تحریک برپا کی تھی اور نومسلموں کو جزیہ سے مستثنیٰ کرنے کی پالیسی کے نفاذ کا وعدہ کیا تھا۔ اشاعتِ دین کے اموی اقدامات ومساعی پر ابھی کامل تحقیق باقی ہے، لیکن یہ ایک حقیقت واقعہ ہے کہ اسی دور میں عام اشاعتِ دین ہوئی تھی۔

- اس مطالعہ میں موالی کے طبقات وافراد کے اسلامی سماج اور خلافت کے نظام سے وابستگی کے بہت سے ثبوت ملتے ہیں۔ ولہاسن وغیرہ نے غیر عرب مسلموں/موالی کی سماجی وانتظامی ڈھانچے سے علیٰحدگی، بلکہ ظلم وزیادتی کے افسانے تراشے ہیں اور ان سے مسلم اہلِ قلم بھی متاثر ہوئے ہیں۔ بعض اور محققین نے بھی ثابت کیا ہے کہ اموی دور میں موالی کو خاصا مقام حاصل تھا۔

- معاشی اور انتظامی معاملات کی صحیح تفہیم کی خاطر مفتوحہ ممالک ودیار کی فتوحات کا مختصر مختصر بیان بھی خاصا وقیع ہے۔

خلافتِ راشدہ سے خلافتِ امویہ تک معاشی اور انتظامی امور ومعاملات کا ارتقا یہ ثابت کرتا ہے کہ تمام خلفاءِ اسلام نے اس پورے نظام کو پروان چڑھانے میں اپنا اپنا کردار ادا کیا تھا۔ ان کے بعض احکام واعمال کے سوا بقیہ کو وہی قانونی، فقہی اور دینی استناد حاصل رہا جو خلفاءِ راشدین کے احکام وانتظامات کو حاصل تھا اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ فقہائے اسلام نے ان اموی احکام واعمال کو بھی اپنے استنباطات وبیانات کا سرچشمہ بنایا ہے اور ان کو دینی ضوابط بتایا ہے۔

☆☆☆